مسئلۂ سود اور قرآن کریم

(۲)

(از جناب مولوی سید احمد قادری صاحب مدرس مدرسہ شمس الہدیٰ پٹنہ)

مسئلۂ سود اور فقہ حنفی | گزشتہ صفحات سے یہ امر بخوبی واضح ہو چکا ہے کہ کتاب و سنت نے سود کو بغیر کسی قید کے حرام کیا ہے اور سود کی تحقیق کے لیے مال معصوم کی قید نہیں لگائی ہے۔ اب ہمیں یہاں یہ دیکھنا ہے کہ ائمۂ احناف رحمہم اللہ نے مسئلۂ ربا کو کس طرح مرتب کیا ہے۔ راقم کا مقصود یہ نہیں ہے کہ ربا کے پورے باب پر بحث کرے بلکہ صرف اس جہت سے فقہ حنفی کی چھان بین مطمح نظر ہے کہ آیا فقہ حنفی میں بھی حرمت ربا اسی طرح مطلق اور غیر مشروط ہے جس طرح کتاب و سنت میں ہے یا فقہ حنفی میں اس کی حرمت مقید اور مشروط ہو گئی ہے۔ دوسری چیز یہ دیکھنی ہے کہ اگر فقہ حنفی میں حرمت ربا مقید ہو گئی ہے تو اس کی بنیاد اور دلائل کیا ہیں؟

فقہ حنفی اس فقہ کا نام ہے جو امام اعظم اور ان کے دو شاگردوں امام ابو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ تعالیٰ کے اجتہادات و استنباطات سے مرتب ہوئی ہے۔ مسئلۂ متنازعہ فیہ میں چونکہ امام ابو یوسف طرفین کے ساتھ نہیں ہیں اس لیے یہاں فقہ حنفی کا لفظ جب استعمال ہو گا تو اس سے مراد طرفین کی رائے ہو گی۔ فقہ حنفی میں امام محمد رحمہ اللہ کی کتابیں بنیاد اور اصل کی حیثیت رکھتی ہیں اور انہی کتابوں پر اس کا دار و مدار ہے۔ بعد کو جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں سب کا ماخذ یہی کتابیں ہیں اس لیے راقم بھی جو کچھ لکھے گا اس کا زیادہ حصہ انہیں کتابوں سے ماخوذ ہو گا۔

سب سے پہلے ہمیں معلوم کر لینا چاہیے کہ فقہ حنفی میں ربا کی کیا تعریف کی گئی ہے۔ امام سرخسی فرماتے ہیں۔

وفی الشریعۃ الربا ھو الفضل الخالی عن العوض المشروط فی البیع۔ (مبسوط ج ۱۲ ص ۱۰۹)

شریعت میں ربا اس زیادتی کو کہتے ہیں جو عوض سے خالی اور بیع میں مشروط ہو۔

اس تعریف میں بدلین (بائع و مشتری میں جن چیزوں کا تبادلہ ہوتا ہے ان کو بدلین کہتے ہیں) کے معصوم ہونے کی کوئی شرط لگی ہوئی نہیں ہے اس لیے ہر اس زیادتی کو سود کہیں گے جو عوض سے خالی اور بیع میں مشروط ہوگی چاہے یہ خرید و فروخت مسلمان اور مسلمان کے درمیان ہو یا مسلمان اور حربی کے درمیان۔ تعریف کے بعد اب یہ دیکھنا ہے کہ ربا کے متعلق ائمہ احناف کی رائے کیا ہے۔

امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کی رائے یہ ہے کہ ربا ان اشخاص کے درمیان حرام ہے جو مسلمان ہوں یا اسلامی حکومت کے زیر اقتدار زندگی بسر کر رہے ہوں۔ حکومت اسلامیہ کے دائرے میں بسنے والے تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ مسلمان، ذمی، مستامن۔ ربا ان ہی تین قسم کے لوگوں کے درمیان حرام ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان اسلامی دائرۂ حکومت سے نکل کر دار الحرب میں حکومت کافرہ سے امن و امان لے کر داخل ہو اس مسلمان اور حربیوں کے درمیان نہ صرف یہ کہ ربا جائز ہے بلکہ تمام عقود فاسدہ جائز ہیں۔ اس مسلمان پر بس اتنی ہی پابندی ہے کہ حربیوں سے غدر و بے وفائی نہ کرے اور ان کے قانون کا پابند رہے۔ اس کے علاوہ ان کی رضامندی سے جس طرح بھی ممکن ہو وہ ان کے اموال حاصل کر سکتا ہے اور وہ حاصل کردہ اموال اس کے لیے حلال و طیب ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی حربی بغیر امان دار الاسلام میں داخل ہو تو اس سے تمام عقود فاسدہ درست ہیں۔ غرض یہ کہ حربی سے بطیب خاطر اس کے اموال کی تحصیل جائز ہے چاہے جیسے بھی ممکن ہو۔ امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کی اس رائے اور خیال کے موافق عبارتیں کتب ظاہر الروایہ میں بھری پڑی ہیں، یہی وہ خیال ہے جس کو کرات و مرات دہرایا گیا ہے اور یہی وہ خیال ہے جس پر دلائل قائم کیے گئے ہیں جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔ اس خیال کے ساتھ کہیں کہیں ایک دوسرا خیال بھی پایا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ مسلم و حربی کے درمیان ربا کا جو معاملہ ہوگا وہ معاملہ ہونے کی حیثیت سے باطل اور حرام ہوگا لیکن اس مسلمان کے قبضے میں جو مال آئے گا وہ اس کے لیے حلال و طیب ہوگا مثلاً ایک مسلمان نے ایک حربی سے کہا کہ میں ایک روپے کو دو روپے کے بدلے میں بیچتا ہوں، اس حربی نے اس بیع کو قبول کیا اور

دو روپے اس مسلمان کے حوالہ کیے تو بیع کا یہ معاملہ حرام ہونے کی وجہ سے باطل ہو گیا لیکن دو روپے جو اس مسلمان کی جیب میں گئے وہ اس کے لیے حلال وطیب ہیں۔ یہ خیال پہلے خیال کے مقابلہ میں کم ظاہر کیا گیا ہے اور اس پر کوئی دلیل بھی قائم نہیں کی گئی ہے۔ امام محمد رحمہ اللہ کی کتابوں میں مسلم و حربی کے درمیان معاملۂ ربا یا دیگر عقود فاسدہ کے متعلق یہی دو خیال پائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی تیسرا خیال ان کی کتابوں میں موجود نہیں ہے۔ اب میں علی الترتیب ان دو خیالوں کے متعلق عبارتیں پیش کرتا ہوں۔

واذا دخل المسلم دار الحرب بامان فلا بأس بان یاخذ منهم اموالهم بطیب انفسهم بای وجه کان	اور جب مسلمان دار الحرب میں امان لے کر داخل ہو تو اس کے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ان کے اموال ان کی رضامندی سے جس طرح بھی چاہے حاصل کرے۔

امام سرخسی امام محمد کی عبارت مذکورہ کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لان اموالهم لا تصیر معصومة بدخوله الیهم بامان ولکنه ضمن بعقد الامان ان لا یخونهم فعلیه التحرز عن الخیانة وبای سبب طیب انفسهم حین اخذ المال فانما اخذ المباح علی وجه منعه عن الغدر فیکون ذلك طیبا له الاسیر والمستامن فی ذلك سواء حتی لو باعهم درهما بدرهمین اوباعهم میتة بدراهم او اخذ مالا منهم بطریق القمار فذلك کله طیب وهذا کله قول ابی حنیفه ومحمد رضی الله عنهما (شرح سیر کبیر ج ۲ ص)	اس لیے کہ اہل حرب کے اموال امان لے کر مسلمان کے ہاں داخل ہو جانے سے معصوم نہیں ہو جاتے، اس پر عقد امان کی وجہ سے اس کی ذمہ داری ہے کہ خیانت نہ کرے پس اس پر واجب ہے کہ خیانت سے بچے، وہ ان سے مال لیتے وقت جس سبب سے بھی خوشنودی حاصل کرے گا تو بے شک وہ مباح مال کو ایسے طریقے سے لیگا جس میں خیانت نہیں لہذا وہ مال اس کے لیے طیب ہوگا، قیدی اور مستامن اس میں برابر ہیں یہاں تک کہ اگر وہ ان سے ایک درہم کو دو درہم کے بدلے میں بیچے یا ان سے مردار کو دو درہموں کے عوض بیچے یا ان سے بطریق قمار مال حاصل کرے تو یہ سب کچھ اس کے لیے طیب ہے اور یہ کل باتیں ابو حنیفہ اور محمد رضی اللہ عنہما کا قول ہے۔

یہ عبارت مسئلہ مبحوث عنہا میں طرفین کے مسلک کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے۔ اور آگے چل کر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے معاملہ کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں:

فتبین انه یجوز عقد الربا بین المسلم والحربی فی دار الحرب (شرح سیر کبیر ج ۴ ص ۱۲۹)

پس یہ بات کھل گئی کہ مسلمان اور حربی کے درمیان دار الحرب میں سود کا معاملہ جائز ہے۔

یہ عبارت صاف طور سے بتا رہی ہے کہ حربی کا مال نہ صرف یہ کہ بطریق ربا لینا جائز ہے بلکہ خود عقد ربا بھی اس سے جائز ہے۔

وقد بینا ان الربا یجوز بین المسلم والحربی فی دار الحرب (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۲۲۹)

اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود جائز ہے۔

امام ابو جعفر طحاوی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے معاملۂ ربا کو دلیل بناتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ففی ذلك ما قد دل ان الربا کان حلالا فیما بین المسلمین وبین المشرکین بمکة لما کانت دار حرب وهو حینئذ حرام بین المسلمین فی دار الاسلام وفی ذلك ما قد دل علی اباحة الربا بین المسلمین وبین اهل الحرب فی دار الحرب کما یقول ابو حنیفه والثوری۔ قال محمد وهو قولنا

اس میں اس بات کی دلیل ہے کہ سود مسلمان اور مشرکین کے درمیان حلال تھا جبکہ مکہ دار الحرب تھا حالانکہ سود اس وقت دار الاسلام میں مسلمانوں کے درمیان حرام تھا اور اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ سود مسلمان اور حربیوں کے درمیان دار الحرب میں مباح ہے جیسا کہ ابو حنیفہ اور ثوری کہتے ہیں۔ محمد نے کہا یہی ہمارا قول ہے۔

یہ عبارت اس بات پر تصریح ہے کہ امام ابو یوسف کے سوا دیگر ائمۂ احناف کے نزدیک ربا کی حرمت مقید ہے دار الاسلام کے ساتھ اور اس بات پر بھی تصریح ہے کہ وہ ربا کو دار الحرب میں حلال و مباح سمجھتے ہیں ـــــ یہ تفصیل تو اس صورت کی تھی کہ مسلمان دار الحرب میں مستامن بن کر جائے اب اس کو بھی دیکھ لینا چاہیے کہ حربی اگر بے امان کے دار الاسلام میں آجائے تو اس حربی سے بھی وہ تمام معاملات

کیے جاسکتے ہیں جو دار الحرب میں رہنے والے حربی سے جائز ہیں۔

ولو عسکرا من اھل الحرب لھم منعۃ دخلوا دار الاسلام ثم السذ من ایھم مسلم و عاملھم بھذہ المعاملۃ التی لا تجوز فیما بین المسلمین فلا باس بذلک (شرح سیر کبیر ج ۳، ص ۲۲۹)

اور اگر حربیوں کا کوئی لشکر جس کو قوت و طاقت حاصل ہو دار الاسلام میں داخل ہو پھر ان سے امان لے کر کوئی مسلمان ان کے پاس جائے اور ایسا معاملہ کرے جو مسلمانوں کے درمیان ناجائز ہیں تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مبسوط میں ہے:

ھذا یجوز بین المسلم والحربی الذی لا امان لہ سواء کان فی دار الاسلام او فی دار الحرب (مبسوط، ج ۱۴، ص ۵۷)

یہ معاملہ مسلمان اور اس حربی کے درمیان جس کو امان حاصل نہیں جائز ہے عام از یں کہ وہ حربی دار الاسلام میں ہو یا دار الحرب میں۔

یہ اور اس قسم کی بکثرت عبارتیں کتب ظاہر الروایہ نیز دیگر ائمہ فقہ کی کتابوں میں بھری پڑی ہیں جن سے بلاشبہ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امام اعظم و امام محمد رحمہما اللہ مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا کے قائل ہیں۔ اتنی تفصیل راقم نے اس لیے پیش کی ہے کہ آجکل کے بعض مشہور اہل علم بزرگوں نے یہ لکھنا شروع کیا ہے کہ امام اعظم کی طرف جواز ربا کا انتساب بہتان ہے۔ اب دیکھنے والے دیکھ سکتے ہیں کہ اگر یہ بہتان ہے تو اس بہتان تراشی کا مجرم کون ہے؟ کیا امام محمد، امام طحاوی، امام سرخسی سب کے سب اپنے امام اعظم پر بہتان لگا رہے ہیں؟ اس تفصیل کے بعد اب دوسرے خیال کی عبارتیں پیش کی جاتی ہیں۔ امام ابویوسف کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

ھذا اخذ مال الکافر بطیبۃ نفسہ و معنی ھذا ان اموالھم علی اصل الاباحۃ الا انہ ضمن ان لا یخونھم فھو یسترضیھم بھذہ الاسباب للتحرز عن

یہ کافر کے مال کو اس کی خوشی سے لینا ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کے اموال اصلاً مباح ہیں بس صرف یہ کہ وہ اس کا ضامن ہے کہ ان کی خیانت نہ کرے پس وہ اس اسباب کے ذریعہ ان کو راضی کرتا ہے تاکہ غدر و خیانت

الغدر، ثم یاخذ اموالھم باصل الاباحۃ باعتبار العقد وبہ فارق المستامنین فی دارنا لان اموالھم صارت معصومۃ بعقد الامان فلا یمکنہ اخذھا بحکم الاباحۃ والاخذ بھذہ العقود الباطلۃ حرام (مبسوط ج ۱۰، ص ۹۵)

سے بچے اس کے بعد وہ ان کے اموال کو اصل اباحت کی بنا پر لیتا ہے نہ کہ باعتبار عقد، اور اسی سے دار الاسلام کے مستامن اور دار الحرب کے حربی کے درمیان فرق ظاہر ہو گیا کیونکہ دار الاسلام کے مستامنوں کے اموال عقد امان کی وجہ سے معصوم ہو گئے ہیں لہٰذا ان کے اموال کو اصل اباحت کی بنا پر لینا ممکن نہیں ہے باقی رہا ان عقود باطلہ

اسی بات کو امام سرخسی پھر دہراتے ہیں:

وھذا لان مال الحربی مباح فھو یتحرز عن الغدر بھذہ الاسباب ثم یتملک المال علیھم بالاخذ لا بھذہ الاسباب (مبسوط، ج ۱۴، ص ۵۷)

اور یہ اس لیے کہ حربی کا مال مباح ہے پس وہ ان اسباب کے ذریعہ غدر سے احتراز کرتا ہے پھر ان کے اموال کا مالک اخذ سے ہوتا ہے ان اسباب کے ذریعہ نہیں۔

یہ خیال پہلے خیال سے متناقض ہے کیونکہ پہلے بالفاظ صریح عقد ربا کو جائز کہا گیا ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی سمجھ سے باہر ہے کہ صرف "اخذ" سے تملک کا قول کیا جائے۔ صرف اخذ سے تملک اس وقت ہوتا ہے جب یہ عقود جانبین میں نہ ہوتے، جب یہ عقود اس "اخذ" کے اسباب بن رہے ہیں تو پھر محض "اخذ" سے تملک کا قول بعید از فہم ہے۔

ایک تیسرا خیال یہ دو خیال تو وہ تھے جو کتب ظاہر الروایہ میں موجود ہیں لیکن امام محمد رحمہ اللہ کے بہت بعد مسلم و حربی کے درمیان معاملہ ربا کے متعلق ہمارے بعض اہل فقہا کو ایک تیسرا خیال یہ پیدا ہوا کہ مسلم و حربی کے درمیان دراصل ربا ہی نہیں ہے اس لیے نہ تحقق ربا کے لیے بدلین کا معصوم ہونا شرط ہے اور اس صورت میں حربی کا بدل غیر معصوم ہے لہٰذا ربا غیر متحقق ہے۔ ملک العلماء کاسانی جریان ربا کے شرائط تحریر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

فمنھا ان یکون البدلان معصومین

شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ بدلین معصوم ہوں

فان كان احدهما غير معصوم لا يتحقق الربا عندنا وعند ابي يوسف هذا ليس بشرط ويتحقق الربا. (بدائع الصنائع ج ۵ ص ۱۹۲)

پس اگر ان دونوں میں سے کوئی غیر معصوم ہو تو ہمارے نزدیک ربا کا تحقق نہیں ہوگا اور ابو یوسف کے نزدیک یہ شرط درست نہیں اور ان کے نزدیک ربا کا تحقق ہو جائے گا۔

گزشتہ صفحات میں قرآن کریم، احادیث نبوی اور کتب ظاہر الروایہ سے ربا کی جو تفصیل پیش کی گئی ہے اس میں تحقق ربا کے لیے کہیں یہ شرط نہیں پائی جاتی۔ ملک العلماء نے اس شرط کو اضافہ کر کے نہ صرف یہ کہ ربا کے متعلق قرآن و حدیث اور جاہلیت عرب کے اطلاقات کو بے معنی کر دیا ہے بلکہ امام محمد رحمہ اللہ کی تفصیلات اور ان کے دلائل کو بھی بے کار بنا دیا ہے اگر طرفین کے نزدیک بغیر اس شرط کے ربا کا تحقق نہ ہوتا تو اتنی بحث وجرح ہی کیوں ہوتی۔ وہ لوگ تو مسلم و حربی کے درمیان اخذ تو خیر اخذ ہی ہے عقد ربا کو جائز کہہ رہے ہیں وہ لوگ تو بقول امام طحاوی ربا کو دار الہجرت میں حرام اور دار الحرب میں حلال کہہ رہے ہیں وہ لوگ تو جواز ربا پر دلیلیں قائم کر رہے ہیں اگر تحقق ربا کے لیے اس شرط کا پایا جانا ضروری ہوتا تو امام محمد رحمہ اللہ کو صرف یہ کہہ دینا چاہیے تھا کہ مسلم و حربی کے درمیان ربا، ربا ہی نہیں رہتا بس ساری بحث ختم ہو جاتی، ملک العلماء نے نیک نیتی سے مسلک حنفی کو اعتراض سے بچانے کے لیے اس شرط کا اضافہ کیا ہوگا لیکن بجائے اس کے کہ اس شرط سے اعتراض دفع ہوتا اس نے اعتراض کو اور قوی کر دیا ہے اس کے علاوہ اس شرط کے اضافہ نے خود امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے ارشادات اور کتب ظاہر الروایہ کی عبارتوں کو فضول اور بے کار کر دیا ہے۔ اگر تحقق ربا کے لیے اس شرط کو مان لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ جاہلیت کے ربا کو ربا کہنا صحیح نہیں اور ہجرت نبوی سے پہلے عرب میں کبھی ربا کا تحقق نہیں ہوا اور آج بھی اسلامی حکومتوں کے دائرے سے باہر دنیا میں کہیں ربا کا وجود نہیں کیونکہ عصمت جان و مال کی تین ہی صورتیں ہیں۔ اسلام، عہد ذمہ، عہد استیمان۔ جو لوگ نہ مسلمان ہیں، نہ ذمی ہیں اور نہ مستامن ہیں ان کے نفوس و اموال غیر معصوم ہیں، ان کے نفوس و اموال پر لفظ معصوم کا اطلاق ہی صحیح نہیں اس لحاظ سے اسلامی حکومتوں کے دائرے سے باہر جتنے غیر مسلم ہیں ان سب کے اموال غیر معصوم ہیں اور جب غیر معصوم ہیں تو وہاں ربا کا وجود کہاں۔ اب غور فرمائیے کہ اس شرط کے اضافہ نے مسلک حنفی کو قوی کیا ہے یا اس کو غیر معقول بنایا ہے لہذا

یہ شرط کسی حیثیت سے صحیح نہیں اور کل شرط لیس فی کتاب اللہ فھو باطل کی کامل مصداق ہے۔

پہلے خیال یعنی جوازِ ربا کے دلائل | مسلم و حربی کے درمیان جوازِ ربا پر ہمارے ائمہ فقہ نے جو دلیلیں قائم کی ہیں وقت آگیا ہے کہ ان کی تنقید کر لی جائے آیا واقعی نصوص شرعیہ میں کوئی ایسی نص یا کوئی ایسی چیز ہے جو اس جواز کے لیے دلیل بن سکے؟

(۱) ثم استدل علیہ بمخاطرۃ ابی بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مع اھل مکۃ فی غلبۃ الروم اھل فارس حتی قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زدہ فی الخطر وابعد فی الاجل فلو لم یکن ذلک جائزاً معھم لما امر بہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۲۱۱)	پھر اس پر ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس شرط سے استدلال کیا جاتا ہے جو انھوں نے اہل مکہ سے اہل فارس پر اہل روم کے غلبہ کی پیشینگوئی پر لگائی تھی یہاں تک کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا تھا کہ شرط کی رقم اور بڑھا دو نیز مدت میں بھی اضافہ کر دیں۔ یہ اگر ان کے ساتھ جائز نہ ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کا حکم نہ دیتے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ اصول حدیث و روایت کے لحاظ سے یہ روایت اس لائق نہیں کہ اس کو کسی حکم شرعی کے ثبوت میں پیش کیا جائے۔ یہ بات اپنی جگہ مسلم ہے کہ کسی حکم شرعی کے ثبوت کے لیے حدیث صحیح کی ضرورت ہے لیکن حیرت ہے کہ ایسے اہم مسئلہ کے استدلال میں ایسی ضعیف روایت پیش کی گئی ہے اور اگر اس روایت کو کسی درجہ میں مان بھی لیا جائے تو شرط کا یہ واقعہ تحریم قمار سے بہت پہلے کا ہے۔ تحریم قمار کی آیت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ واقعہ ہجرت سے پانچ چھ سال پہلے کا ہے تو پھر تحریم قمار سے پہلے کے واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا کس طرح صحیح ہوگا۔ اگر کوئی شخص دار الحرب میں شرب خمر کے جواز کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے مکہ میں شرب خمر کو استدلال میں پیش کرے تو یہ استدلال صحیح ہوگا؟ تعجب ہے کہ ربا جیسے اہم ترین مسئلہ کے لیے اتنا نادرست استدلال کس طرح پیش کیا گیا ہے۔

(۲) واستدل بمصارعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رکانۃ حین کان بمکۃ ثلاث مرات	اور استدلال کیا گیا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور رکانہ کے درمیان کشتی سے جب آپ مکہ میں تھے یہ کشتی تین بار

في كل مرة بثلث غنمه ولو كان مكروها ما فعله رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم لما صرعه في المرة الثالثة قال ما وضع احد جنبي قط وما انت صرعتني فرد رسول الله صلى الله عليه وسلم الغنم عليه

(شرح سیر کبیر ج ۴ ص ۹۰)

ہوئی تھی اور ہر بار اس کے غنم کے ایک تہائی پر ہوئی تھی اگر یہ ناجائز ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسا نہ کرتے پھر جب آپ نے اس کو تیسری بار پچھاڑا تو اس نے کہا کسی شخص نے کبھی میری پیٹھ نہیں لگائی اور نہ تم نے مجھے پچھاڑا ہے پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اس کا ریوڑ واپس کر دیا۔

یہ استدلال بھی ویسا ہی استدلال ہے جیسا پہلا، یہ روایت بھی اصول روایت و حدیث کے اعتبار سے ناقابل اعتبار اور مجروح ہے۔ یہ واقعہ بھی تحریم قمار سے پہلے کا ہے اس لیے اس سے استدلال صحیح نہیں نفس واقعہ کے لحاظ سے بھی تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس واقعہ میں شرط کا سرے سے کوئی قصہ ہی نہیں پیش آیا۔ اس روایت کے منتہی فن سیرت کے امام ابن اسحاق اور ابن ہشام ہیں، ان دونوں کے سوا متقدمین اہل سیر میں سے شاید کسی نے بھی اس واقعہ کو سیرت نبوی میں درج نہیں کیا۔ اب ملاحظہ فرمائیے کہ فن سیرت کے یہ دونوں امام اس واقعہ کو کس طرح پیش کرتے ہیں۔ ابن ہشام ایک الگ فصل میں لکھتے ہیں:

قال ابن اسحاق وحدثني ابي اسحق بن يسار قال كان ركانة بن عبد يزيد بن هاشم بن عبد المطلب بن عبد مناف اشد قريش فخلا يوما برسول الله صلعم في بعض شعاب مكة فقال له رسول الله صلى الله عليه وسلم يا ركانة الا تتق الله وتقبل ما ادعوك اليه قال اني لو اعلم ان الذي تقول حق لاتبعتك فقال له رسول الله صلعم أرأيت ان صرعتك

ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے ابو اسحاق بن یسار نے روایت کی، رکانہ بن عبد یزید قریش کا پہلوان تھا، ایک دن مکہ کی بعض گھاٹیوں میں اس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنہائی میں ملاقات ہوئی۔ پس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اے رکانہ اللہ سے ڈرتا نہیں اور میں جس چیز کی دعوت دیتا ہوں اس کو قبول نہیں کرتا اس نے کہا اگر مجھے علم ہوتا کہ جو بات تم کہتے ہو حق ہے تو میں ضرور تمہاری پیروی کرتا آپ نے فرمایا تیرا کیا خیال ہے اگر میں تجھے پچھاڑ دوں تو تجھے علم ہو جائے گا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں حق ہے

اتعلم ان ما اقول حق قال نعم قال فقم حتى اصارعك فقام اليه ركانة يصارعه فلما بطش به رسول الله صلعم اضجعه وهو لا يملك من نفسه شيئاً ثم قال عد يا محمد فعاد فصرعه فقال يا محمد والله ان هذا العجب اتصرعني فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم واعجب من ذلك ان شئت ان اريكه ان اتقيت الله واتبعت امري قال ما هو قال ادعو لك هذه الشجرة التي ترى فتاتيني قال ادعها فدعاها فاقبلت حتى وقعت بين يدي رسول الله صلعم قال فقال لها ارجعي الى مكانك فرجعت الى مكانها قال فذهب ركانة الى قومه فقال يا بني عبد مناف ساحروا بصاحبكم اهل الارض فوالله ما رايت اسحر منه قط ثم اخبرهم بالذي راى والذي صنع۔ (سیرت ابن ہشام ص ۲۵۸ مطبوعہ لندن)

اس نے کہا ہاں۔ آپ نے کہا تو کھڑا ہو تاکہ میں تجھ سے کشتی لڑوں رکانہ آپ کی طرف بڑھا آپ نے جب اس کو پکڑا تو زمین پر لٹا دیا اور رکانہ بالکل بے قابو تھا اس نے کہا اے محمد دوبارہ۔ آپ نے دوسری بار بھی اس کو پچھاڑ دیا رکانہ نے کہا اے محمد بخدا یہ تعجب خیز بات ہے کیا تم نے مجھے پچھاڑا ہے؟ آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو میں اس سے بھی زیادہ تعجب خیز شے دکھاؤں اگر تو خدا سے ڈرے اور میری پیروی کرے اس نے کہا وہ کیا چیز ہے آپ نے فرمایا میں اس درخت کو بلاؤں گا جس کو تو دیکھ رہا ہے پس وہ میرے پاس آجائے گا اس نے کہا بلاؤ، اس کو پکارا تو وہ آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا ہو گیا پھر آپ نے فرمایا اپنی جگہ پر واپس جا تو وہ واپس ہو گیا۔ راوی کا بیان ہے کہ رکانہ اپنی قوم کے پاس گیا اور کہا کہ اے بنی عبد مناف تم محمد کے ساتھ تمام اہل زمین سے جادو میں مقابلہ کرو بخدا میں نے اس سے بڑا جادوگر کبھی نہیں دیکھا پھر اس نے جو دیکھا تھا اور اس کے ساتھ جو ہوا تھا ان کو بتایا۔ ....

اس تصریح سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود رکانہ کو دعوت اسلام پیش کی تھی اس دعوت کے جواب میں اس نے معجزہ طلب کیا اور طلب معجزہ کے جواب میں مصارعۃ کا واقعہ پیش آیا اور جب اس سے بھی مطمئن نہ ہوا تو درختوں کا معجزہ پیش کیا گیا لیکن وہ اس وقت اس کے بعد

بھی ایمان نہ لایا۔ اس واقعہ میں نہ تو غنم پر کسی شرط کا قصہ ہے اور نہ رد غنم کا کوئی ذکر، یہ مصارعۃ دعوت اسلام کے سلسلے میں پیش آئی یہاں شرط کا کیا ذکر۔ تحریم قمار سے پہلے ہی سہی لیکن کسی شرط پہ مصارعۃ کا انتساب ذات نبوی کے ساتھ دل قبول نہیں کرتا تھا بحمد اللہ کہ سیرت ابن ہشام کے مطالعہ نے یہ کھٹک بھی دور کردی اب غور فرمائیے کہ اس واقعہ کو مسئلۂ مبحوث عنہا سے کسی طرح کا بھی کوئی لگاؤ ہے؟ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اسی واقعہ کو غالباً ابن اسحٰق کی اصل کتاب سے بایں الفاظ تحریر فرماتے ہیں:

"محمد بن اسحاق در کتاب خود آوردہ کہ در مکہ مردے بود رکانہ نام شدید القوۃ کہ در صنعت کشتی گیری بے ہمتا و یگانہ بود و مردم از بلاد برائے مصارعت وے می آمدند و ہمہ را بر زمین می افگند ناگاہ روزے در شعبے از شعاب مکہ با آں حضرت پیش آمد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم با وے گفت اے رکانہ از خدا نمی ترسی و چرا دعوت مرا قبول نمی کنی رکانہ گفت اے محمد چیزے بیار کہ گواہی دہد بر صدق تو اگر کشتی گیرم و ترا بیندازم ایمان می آری گفت نعم فرمود آمادہ شو برائے کشتی پس آمادہ گشت رکانہ برائے کشتی و آنحضرت در جامہائے خود و ردائے و ازارے در بر داشت پس آمد نزدیک رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم بوے و بگرفت وے بر زمین زد پس حیران و متعجب شد رکانہ در خواست از آنحضرت کہ رہا کند او را و باز کشتی گیرد بار دوم و سوم نیز بینداخت پس متعجب شد رکانہ گفت کہ شان تو عجیب است ہمیں مقدار آوردہ اند حدیث و بیان نہ کردہ اند کہ اسلام آورد یا نہ واللہ اعلم"

(مدارج النبوۃ ج ا صفحہ ۹۴ مطبوعہ نول کشور)

حافظ ابن عبد البر نے استیعاب میں رکانہ کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے اور ان کا انتقال حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں ہوا۔ بحمد اللہ کہ اس تفصیل سے یہ بات منقح ہوگئی کہ واقعۂ رکانہ کو اس مسئلے سے کسی طرح کا لگاؤ ہی نہیں ہے۔

(۳) واستدل علیہ ایضاً بحدیث بنی قینقاع فان النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین اجلاھم قالوا ان لنا دیونا لم تحل

اور اس پر حدیث بنی قینقاع سے بھی استدلال کیا گیا ہے اس لیے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جلا وطن کیا تو انھوں نے کہا کہ لوگوں کے ذمہ ہمارے قرض باقی

بعد فقال تعجلوا وضعوا ولما اجلی بنی النضیر قالوا ان لنا دیونا علی الناس فقال ضعوا وتعجلوا ومعلوم ان مثل هذا المعاملة لا یجوز بین المسلمین فان کان له علی غیره دین الی اجل فوضع عنه بعضه بشرط ان یعجل بعضه لم یجز کره ذلک عمر و زید بن ثابت وابن عمر رضی الله عنهم ثم جوز رسول الله صلی الله علیه واله وسلم فی حقهم لانهم کانوا اهل حرب فی ذلک الوقت ولهذا اجلاهم فعرفنا انه یجوز بین الحربی والمسلم ما لا یجوز بین المسلمین

(شرح سیر کبیر ج ۳ ص ۱۸۰)

ہیں اور ادا کا وقت ابھی نہیں آیا تو آپ نے فرمایا جلدی کرو اور وضع کرو اور جب آپ نے بنی نضیر کو جلا وطن کیا تو انھوں نے کہا لوگوں کے ذمہ ہمارے قرض باقی ہیں آپ نے فرمایا وضع کرو اور جلدی کرو اور یہ بات معلوم ہے کہ اس قسم کا معاملہ مسلمانوں کے درمیان جائز نہیں اس لیے کہ کسی کا کسی پر اگر دین ایک مقررہ مدت تک کے لیے ہو اور وہ اس میں سے کچھ اس شرط پر کم کر دے کہ بقیہ حصہ جلدی سے ادا کر دیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے اس کو ناجائز سمجھا ہے عمر و زید بن ثابت و ابن عمر رضی اللہ عنہم نے پھر اس کو جائز قرار دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے حق میں اس لیے کہ وہ اس وقت حربی تھے اور اسی لیے ان کو جلا وطن کیا ۔ پس ہم نے سمجھا کہ حربی اور مسلم کے درمیان وہ چیز جائز ہے جو مسلمانوں میں جائز نہیں

بنی قینقاع کو باتفاق محدثین و اہل سیر غزوۂ بدر کے بعد ۲ھ میں جلا وطن کیا گیا ہے اور تحریم ربا کی پہلی آیت غزوۂ احد کے بعد ۳ھ میں نازل ہوئی ہے اس لیے بنی قینقاع کے واقعہ کو استدلال میں پیش کرنا صحیح نہیں۔ بنی نضیر کے اجلا کے متعلق دو رائیں ہیں امام بخاری و امام سہیلی کی رائے یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ احد سے پہلے ہوا اور دیگر جمہور اہل سیر کی رائے یہ ہے کہ غزوہ احد کے بعد ۴ھ میں ہوا۔ راقم اس آخری رائے کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی گزارشیں پیش کرتا ہے۔

(۱) وضع دین کا جواز و عدم جواز صحابہ کرام اور تابعین کے درمیان مختلف فیہ رہا ہے جن حضرات کے نزدیک یہ ناجائز ہے تو ہر جگہ ناجائز ہے چاہے دار الاسلام ہو یا دار الحرب اور جن حضرات کے نزدیک یہ جائز ہے تو ہر جگہ جائز ہے دار الاسلام ہو یا دار الحرب، عہد صحابہ میں دار الاسلام میں عدم جواز اور دار الحرب میں جواز کی تفریق بالکل نہیں پائی جاتی۔

وقد روی سفیان عن حمید عن میسرۃ قال سألت ابن عمر یکون لی علی الرجل الدین الی اجل فاقول عجل لی واضع عنک فقال ھو ربا وروی عن زید بن ثابت ایضا النھی عن ذلک وھو قول سعید بن جبیر والشعبی وھو قول اصحابنا وعامۃ الفقہاء وقال ابن عباس وابراھیم النخعی لا باس بذلک

(احکام القرآن للجصاص ج ۱ ص ۵۵۴ مطبوعہ مصر)

سفیان نے حمید انھوں نے میسرہ سے روایت کی ہے انھوں نے کہا میں نے ابن عمر سے پوچھا میرا قرض کسی شخص کے ذمہ باقی ہو اور میں مدت پوری ہونے سے پہلے اس سے کہوں کہ قرض جلدی ادا کر دے میں کچھ کم کر دیتا ہوں تو یہ جائز ہے یا نہیں ابن عمر نے جواب دیا یہ سود ہے زید بن ثابت سے بھی ممانعت مروی ہے اور یہی سعید بن جبیر اور شعبی کا قول ہے اور یہی ہمارے اصحاب اور عام فقہا کا مذہب ہے اور ابن عباس اور ابراہیم نخعی نے کہا اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اس تصریح سے ظاہر ہے کہ وضع دین کے مسئلہ کا اختلاف دار الاسلام و دار الحرب کی بحث سے بالکل الگ ہے امام نخعی جن کی تائید مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا پر پیش کی جاتی ہے وہ وضع دین کو دار الاسلام میں بھی جائز کہہ رہے ہیں تو پھر اس مختلف فیہ مسئلہ کو جس میں اختلاف دارین کا کوئی دخل نہیں مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا کی دلیل کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

(۲) استدلال کی بنیاد اس پر رکھی گئی ہے کہ اجلا کے وقت بنی نضیر حربی تھے۔ راقم عرض کرتا ہے کہ وہ اجلا کے وقت حربی نہ تھے بلکہ مغلوب و مقہور دشمن تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر مصالحت کر لی تھی کہ ان لوگوں کو جلاوطن کر دیا جائے، اس لیے جانبین سے لڑائی بند ہو گئی تھی اور اللہ کے رسول نے ان کو امان دے دیا تھا اس مصالحت کا ذکر خود امام سرخسی اس مقام سے پہلے کر چکے ہیں۔ اگر کوئی سوال کرے کہ اس مصالحت کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ جائز تھا کہ ان پر حملہ کرے، ان کو قتل کرے یا ان کا مال لوٹ لے تو کیا اس کا جواب اثبات میں دیا جا سکتا ہے؟ نہیں دیا جا سکتا اس لیے کہ اسلامی حکومت ان کو جلاوطن ہو جانے کی شرط پر امان دے چکی تھی اس لیے اس وقت ان کی حیثیت مامون حربی کی تھی اور مامون حربی سے ربا کا معاملہ خود حنفیہ کے یہاں ناجائز ہے۔ اب یہ بات واضح ہو گئی کہ امام محمد رحمہ اللہ کی بیان کردہ روایت

اس کے بجائے کہ امام اعظم کے مسلک کی مستدل بنے امام نخعی کی مستدل بن سکتی ہے جو اس جزئی معاملہ کو مسلمانوں کے درمیان بھی جائز کہتے ہیں لہٰذا معلوم ہوا کہ مسلم و حربی کے درمیان جواز ربا کے لیے یہ روایت بھی کسی طرح دلیل نہیں بن سکتی۔

(۴) قال رحمہ اللہ ذکر عن مکحول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لا ربا بین المسلمین وبین الحربی فی دار الحرب وھذا الحدیث وان کان مرسلا فمکحول فقیہ ثقۃ والمرسل من مثلہ مقبول وھو دلیل لابی حنیفۃ ومحمد رحمہا اللہ فی جواز بیع المسلم الدرھم بالدرھمین من الحربی فی دار الحرب (مبسوط ج ۱۴ ص ۵۶)

مکحول نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی کہ آپ نے فرمایا دار الحرب میں مسلمانوں اور اہل حرب کے درمیان سود نہیں۔ یہ حدیث اگرچہ مرسل ہے لیکن مکحول فقیہ اور ثقہ ہیں اور ان کے جیسے لوگوں کی حدیث مرسل مقبول ہے اور یہ حدیث ابوحنیفہ اور محمد رحمہما اللہ کی دلیل ہے اس مسئلہ میں کہ مسلمان کے لیے حربی سے دار الحرب میں ایک درہم کو دو درہموں کے بدلے میں بیچنا جائز ہے۔

تنہا ایک یہی حدیث ہے جو امام اعظم رحمہ اللہ کے مسلک کے لیے صحیح طور پر مستدل کی حیثیت رکھتی ہے لیکن اس دلیل کا ضعف اتنا بین ہے کہ اس پر کسی طویل بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ حدیث نہ صرف یہ کہ مرسل ہے بلکہ مجہول بھی ہے کیونکہ امام ابوحنیفہ اور مکحول کے درمیان کا راوی لامعلوم ہے۔

قال ابن العز قال فی المغنی ھذا خبر مجھول لم یرو فی صحیح ولا مسند ولا کتاب یوثق بہ وھو مع ذلک مرسل محتمل[۱]

(۵) وحجتنا فی ذلک ما روینا وما ذکر عن ابن عباس رضی اللہ عنہ

اور ہماری دلیل اس میں وہ ہے جو ہم نے روایت کی (یعنی روایت مکحول) اور وہ جو حضرت عباس وغیرہ سے

[۱] حاشیہ سعدی چلپی علی عنایہ شرح الہدایہ۔ یہ حوالہ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی مدظلہ کے مقالہ سے اخذ کیا گیا ہے جو معارف اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔

قال فی خطبته کل ربا کان فی الجاھلیة
فھو موضوع واول ربا یوضع ربا العباس
بن عبد المطلب وھذا لان العباس
رضی اللہ عنه بعد ما اسلم رجع الی مکة
وکان یربی وکان یخفی فعله عن رسول اللہ
صلی اللہ علیه وسلم فما لم ینھه عنه
دل ان ذلک جائز وانما جعل الموضوع
من ذلک ما لم یقبض حتی جاء الفتح وبه
نقول وفیه نزل قوله تعالیٰ وَذَرُوْا
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (مبسوط جلد ۱۴، صفحہ ۵۷)

مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ میں فرمایا:
جاہلیت کا تمام سود باطل ہے اور سب سے پہلا سود جو باطل
کیا جاتا ہے وہ عباس بن عبد المطلب کا سود ہے۔ اور یہ اس لیے
کہ عباس رضی اللہ عنہ اسلام لانے کے بعد مکہ واپس گئے
اور وہ سود لیا کرتے تھے اور اپنا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے چھپاتے تھے پس جب آپ نے ان کو اس سے منع نہیں فرمایا
تو اس سے دلیل ملی کہ یہ جائز ہے آپ نے ان کے سود میں سے اس کو
باطل کیا جس پر قبضہ نہ ہوا تھا یہاں تک کہ مکہ فتح ہوا اور
یہی ہم کہتے ہیں اور اسی معاملہ میں اللہ کا قول وَذَرُوْا
مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا نازل ہوا۔

حجۃ الوداع کے خطبے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے جس سود کے اسقاط کا قانونی اعلان فرمایا وہ ان کے زمانہ جاہلیت وکفر کا سود تھا نہ کہ زمانۂ اسلام کا خود اس حدیث کے الفاظ اس کی تصریح کر رہے ہیں۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ اعلان وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا کو قانونی طور پر نافذ کرنا تھا اور تفسیر ابن جریر طبری وغیرہ میں اس کی تصریح موجود ہے کہ آیت حضرت عباس کے اس سود کے متعلق ہے جو ان کے اسلام سے پہلے کا تھا۔

وذکر الامام الزاھد قصة الآية
بتفصیل طویل وذکر انھا علی روایة
نزل فی شان عباس رضی اللہ عنه
حیث اربی الناس فحین اسلم اراد ان
یرده فقیل له وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ فقال العباس انا

امام زاہد نے آیت کے قصے کو طویل تفصیل کے ساتھ
ذکر کیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ یہ آیت ایک روایت کی
بنا پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی شان میں نازل ہوئی
چونکہ انھوں نے لوگوں سے سودی کاروبار کیا تھا جب
اسلام لائے تو چاہا کہ سود ان لوگوں سے وصول کریں
ان سے کہا گیا کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ

مومن وترک الربا۔ مُؤمِنِیْنَ نازل ہوئی انھوں نے کہا کہ میں مسلمان ہوں اور

(اکلیل علی مدارک التنزیل) سود چھوڑ دیا۔

امام سرخسی نے جو باتیں لکھی ہیں وہ بے ثبوت ہیں۔ اسلام لاکر حضرت عباس کا مکہ واپس جانا ثابت نہیں۔ اظہار اسلام اور تحریم ربا کے بعد ان کا مکہ میں سودی کاروبار کرنا قطعاً غلط ہے۔ امام سرخسی کا یہ کہنا کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سود لیتے تھے اور اپنا فعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے چھپاتے تھے ایک نہایت غلط بات ہے جو نادانستہ طور پر ان کی زبان سے نکل گئی ہے اگر امام سرخسی کو اس کا احساس ہوتا کہ ان کا یہ جملہ کان یخفی فعلہ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت عباس کو کس پوزیشن میں رکھ رہا ہے تو ان کی زبان سے ایسی بات نہ نکلتی اور لطف یہ ہے کہ اس جملے نے خود ان کے استدلال کو ختم کر دیا ہے کیونکہ ان کا رسول سے مخفی کرنا سود کے عدم جواز کو بتا رہا ہے نہ کہ جواز کو، باقی رہا یہ کہنا کہ "جب رسول نے ان کو اس سے منع نہیں کیا تو معلوم ہوا کہ جائز تھا" یہ اس بات پر موقوف ہے کہ رسول کو اس کا علم بھی ہوا ہو اس لیے پہلے یہ ثابت کرنا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا کہ حضرت عباس نے اسلام اور تحریم ربا کے بعد مکہ میں سودی کاروبار کیا اور آپ نے اس علم کے باوجود ان کو منع نہیں کیا لیکن یہ ایسی بات ہے جس کا قیامت تک ثبوت نہیں مل سکتا۔ دراصل حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام اور حرمت ربا کی تاریخ پیش نظر نہ رہنے کی وجہ سے یہ ساری الجھنیں پیدا ہو رہی ہیں اس لیے چند باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ یہ الجھن دور ہو۔

(۱) حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے اسلام کی تاریخ کے اختلافات سے قطع نظر اتنا مسلم ہے کہ مکہ میں ان کا اسلام مخفی تھا اور وہاں وہ علانیہ مسلمان کی حیثیت سے مقیم نہ تھے بلکہ مشرکین ان کو اپنا آدمی سمجھتے تھے، انھوں نے فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی اور بالاعلان رسول کے دست حق پرست پر اسلام کی بیعت کی اور باضابطہ مہاجرین کی صف میں داخل ہوئے اس لیے ان کی اس مکی زندگی کے معاملات کو جو انھوں نے ہجرت سے پہلے گزاری جواز و عدم جواز کے لیے سند بنانا صحیح نہیں۔ حافظ ابن حجر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے مکہ میں اخفائے اسلام کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ورجع الی مکة فیقال انه اسلم	اور وہ مکہ واپس گئے کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام لے آئے
وکتم قومه وصار یکتب الی النبی صلی اللہ	اور اپنے اسلام کو اپنی قوم سے چھپایا اور رسول اللہ
علیه وسلم بالاخبار ثم هاجر قبل	صلی اللہ علیہ وسلم کو خبریں لکھنے لگے پھر فتح مکہ سے
الفتح بقلیل (اصابہ ج ۴ ص ۳۰ مطبوعہ مصر)	کچھ پہلے ہجرت کی۔

حافظ ابن عبدالبر استیعاب میں تحریر فرماتے ہیں:

قال ابو عمر اسلم العباس قبل	ابوعمر نے کہا عباس فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور
فتح خیبر وکان یکتم اسلامه ثم اظهر	اپنا اسلام چھپائے رہتے تھے پھر اپنا اسلام فتح مکہ
اسلامه یوم فتح مکة (استیعاب ج ۲ ص ۴۹۰ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد)	کے دن ظاہر کیا۔

(۲) تحریم ربا کے متعلق گزشتہ صفحات میں لکھا جاچکا ہے کہ سود کس طرح بتدریج حرام ہوا ہے۔ ربا کی حرمت بھی اسی طرح بتدریج ہوئی ہے جس طرح شراب کی حرمت۔ ربا کی بالکلیہ اور مطلق حرمت اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا سنہ میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی مدظلہ نے سیرت النبی میں تحریر فرمایا ہے اور اس سلسلے کی آیت وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا بروایت طبری فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی ہے اور اس پر تو غالباً سب کا اتفاق ہے کہ قرآن میں حرمت وحلت کے جو احکام نازل ہوئے ہیں ان میں حرمت ربا کی تفصیلی آیتیں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہیں۔ اور ان کے نزول کی مدت سنہ اور اس کے بعد ہے۔ حرمت ربا کی جن آیتوں پر اس معاملہ کی مطلق اور بہمہ وجوہ حرمت کی بنیاد قائم ہے وہ اس سن میں نازل ہوئی ہیں جس میں حضرت عباس ہجرت فرما چکے ہیں، اس لیے بالفرض اگر مکہ میں ان کا کوئی سودی معاملہ ہو بھی تو وہ تحریم مطلق سے پہلے کا ہے۔

(۳) یہ بات کسی ضعیف روایت سے بھی ثابت نہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو تحریم ربا کا علم حاصل ہوا ہو اور علم کے بعد انھوں نے سودی کاروبار کیا ہو اور شریعت کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ بغیر علم کے کوئی ذمہ داری نہیں۔ جو لوگ حضرت عباسؓ کے ربا کو مسلم وحربی کے درمیان جواز ربا کے لیے یا اس کے بدلے میں حاصل شدہ روپے کی حلت کے لیے دلیل بناتے ہیں ان کو ثابت کرنا چاہیے کہ وہ مکہ میں اسلام

کا اعلان کر چکے تھے اور یہ کہ ان کو حرمت ربا کی خبر مل گئی تھی اور اعلان اسلام و اطلاع حرمت کے باوجود انھوں نے یہ معاملہ کیا لیکن یہ باتیں کبھی بھی ثابت نہیں کی جاسکتی ہیں؟ کلا ثم کلا۔

ان دلائل پر بحث کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ نصوص شرعیہ میں کوئی ایک واقعہ کوئی ایک بات کوئی ایک چیز بھی ایسی نہیں جو اس مسئلہ میں مسلک حنفی کے لیے دلیل بن سکے، ان تمام استدلالات کو پڑھ کر دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یا للعجب وہ تمام اصول اور احتیاطیں جو فقہ حنفی کا طرۂ امتیاز ہیں وہ اس مسئلے میں کہاں رخصت ہو گئی ہیں۔

دوسرے خیال کی تنقید | کتب ظاہر الروایہ میں دوسرا خیال جو یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ مسلم و حربی کے درمیان عقد ربا تو باطل ہے لیکن حاصل شدہ مال طیب اور حلال ہے اس کے متعلق نہ کوئی نقلی دلیل پیش کی گئی ہے اور نہ موجود ہے اس کی بنیاد صرف عقل پر ہے، اس کی ساری بنیاد اس پر قائم ہے کہ حربی کا مال چونکہ غیر معصوم ہے اس لیے مسلم مستامن اس پر قبضہ کرنے کے بعد اس کا مالک ہو جاتا ہے اور وہ اس کے لیے حلال ہو جاتا ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شریعت میں ایسی کوئی سند موجود نہیں کہ حرام ذریعہ سے حاصل کردہ مال کسی مسلمان کے لیے حلال ہو جائے، دیکھنا یہ ہے کہ اس خیال کی اصل کیا ہے؟ دراصل اس کا ڈانڈا اموال غنیمت وفے کے حلال ہونے کی علت سے جا ملتا ہے۔ ہمارے فقہائے احناف رحمہم اللہ کے نزدیک اموال غنیمت وفے کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا ہے ان کی عدم عصمت ہی علت حلت ہے اسی لیے امام اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ قیاس فرمایا ہے کہ جب الحربی کا مال لوٹ لینا اور چھین لینا درست ہے تو رضامندی سے ان کے اموال پر قبضہ کرنا بدرجہ اولیٰ جائز ہو گا۔ مشرک کی لاش کو مشرکوں کے ہاتھ فروخت کرنے کے جواز کا فتویٰ دیتے ہوئے امام صاحب فرماتے ہیں:

ولو قتل المسلمون رجلا من المشركين فاراد اهل الحرب ان يشتروه منهم فان اباحنيفة قال لاباس بذالك الا ترى ان اموالهم يحل للمسلمين ان	اگر مسلمانوں نے کسی مشرک کو قتل کر دیا اور اہل حرب نے چاہا کہ اس کی لاش کو خرید یں تو ابوحنیفہ نے فرمایا کہ اس میں مضائقہ نہیں کیا تم نہیں دیکھتے ہو کہ ان کے اموال کو غصب کر لینا مسلمانوں کے لیے حلال ہے

خذن وھابالغصب فاذا طابت انفسھم	تو جب ان کے نفوس رضامند ہوں تو ایسا مال
بھا فھو احل وافضل	زیادہ حلال اور اچھا ہوگا۔

یہاں راقم کے لیے ضروری ہے کہ اموال غنیمت و فے کے حلال ہونے کی علت پر بحث کرے اور یہ دیکھے کہ اموال کی عدم عصمت کسی شرعی حکم کے لیے علت بن سکتی ہے یا نہیں؟

حلت غنیمت کی علت | غنیمت، فے اور بطور سلب ونہب حاصل کیے ہوئے اموال کی حلت کی علت کیا ہے؟ یعنی مشرکین محاربین سے جو اموال بطور غنیمت حاصل ہوتے ہیں یا بطور فے ان پر قبضہ کیا جاتا ہے یا لوٹ کر چھین کر تصرف میں لایا جاتا ہے تو یہ اموال مسلمانوں کے لیے کیوں حلال ہو جاتے ہیں؟

یہ بہت ہی اہم سوال ہیں جس کو حل کرلینا ضروری ہے کیونکہ مسلم وحربی کے درمیان مسئلہ متنازعہ فیہ اور دیگر مسائل جزیہ کا جو طویل باب فقہ حنفی میں مرتب ہوا ہے اس کی بنیاد اسی علت پر ہے۔ ان اموال کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا بتایا جاتا ہے یعنی یہ اموال مسلمانوں کے لیے اس لیے حلال ہو جاتے ہیں کہ یہ غیر معصوم ہیں ان کی عدم عصمت ہی ان کی حلت کی اصل علت ہے۔ اس اجتہادی علت کو اصل بنا کر ہمارے ائمہ نے اس پر سیکڑوں مسائل متفرع فرمائے ہیں اور یہ اجتہادی علت ان کے اذہان عالیہ پر اس قدر غلبہ پائے ہوئی تھی کہ جیسے یہ بھی کوئی نص قطعی ہے۔ مسلم وحربی کے درمیان مسائل متفرعہ کا پورا باب پڑھ جایئے بکثرت یہی علت کام کرتی ہوئی نظر آئے گی اور حد تو یہ ہے کہ جو چیزیں نصوص قطعیہ سے حرام وناجائز تھیں وہ اس اجتہادی علت کی وجہ سے مشروط ومقید ہوگئی ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ہمارے فقہائے نے جو یہ علت بیان فرمائی ہے اس کی بنیاد کیا ہے۔ جہاں تک راقم الحروف سمجھ سکا ہے اس کی بنیاد یہ ہے کہ انھوں نے بعض احادیث کو سامنے رکھ کر اموال کی دو قسمیں قرار دی ہیں۔ معصوم اور غیر معصوم۔ چونکہ غنیمت و فے کا تعلق اموال غیر معصوم سے ہے اس لیے انھوں نے ان اموال کے غیر معصوم ہونے ہی کو حلت کی علت قرار دیدیا ہے۔ جس حدیث سے یہ تقسیم نکالی جاتی ہے وہ یہ ہے:

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا	مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے مقاتلہ کروں یہاں تک کہ
ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ	وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد اللہ کے

ویقیموا الصلوٰۃ ویوتوا الزکوٰۃ فاذا فعلوا ذلک عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ (بخاری شریف)	رسول ہیں اور یہ کہ وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں پس جب وہ یہ کرلیں تو انھوں نے مجھ سے اپنی جانوں اور مالوں کو بچا لیا مگر بحق اسلام اور ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

یہ حدیث بالفاظ مختلف صحاح میں آتی ہے لیکن سب کا مفہوم اور حاصل ایک ہے اس حدیث سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم یہ تعلیم فرما رہے ہیں کہ ہماری لڑائی غیر مسلموں سے کسی ذاتی عناد یا حصول مال کے لیے نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ وہ اللہ کے باغی ہیں جیسے ہی کہ وہ اس بغاوت سے باز آکر مسلم بن جائیں گے ہماری لڑائی ان سے بند ہو جائے گی اب ہم نہ ان سے مقاتلہ کریں گے اور نہ ان کے اموال پر قبضہ کریں گے، ان کے نفوس و اموال حق اسلام کے عوض محفوظ ہو جائیں گے، نیز یہ کہ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے یہ مقاتلہ و جہاد تا قیامت جاری رہے گا یہی مقصد ہے اس ارشاد نبوی کا ورنہ ظاہر ہے یہ حدیث نہ تو قتال و عدم قتال کی تمام صورتوں کو بیان کرتی ہے اور نہ اس سے نفوس و اموال کی کوئی ایسی تقسیم نکلتی ہے جو احکام شرعیہ میں کسی طرح کا دخل رکھتی ہو۔ الا بحق الاسلام کا ٹکڑا صاف بتا رہا ہے کہ ایمان لانے کے بعد بھی نفوس و اموال مطلقاً معصوم نہ ہوں گے بلکہ یہ عصمت اس وقت تک رہے گی جب تک ایک مسلمان خدا و رسول کا پورا پورا فرمانبردار بنا ہوا ہے ورنہ جیسے ہی کہ اطاعت سے قدم باہر نکال کر فساد انگیزی کرے گا اس کی جان اور مال دونوں ہی شریعت کی نظر میں غیر معصوم ہو جائیں گے اور جان کے بدلے میں اس کی جان، و مال کے بدلے میں اس کا مال لے لیا جائے گا اسی طرح اس حدیث سے اشارتاً بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جن غیر مسلموں سے مسلمانوں کی لڑائی ہے ان کے نفوس و اموال ایسے غیر معصوم ہیں کہ مسلمانوں کو ہر طرح ان میں تصرف کا حق ہے بلکہ خدا و رسول نے ان کے نفوس و اموال میں تصرف کے حدود متعین کر دیے ہیں اور کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ ان حدود سے باہر قدم نکالے اس حدیث سے بطور مفہوم مخالف جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ اتنا ہی ہے کہ الحربی کے نفوس و اموال محفوظ نہیں ہیں، ان کو قتل کیا جا سکتا ہے اور ان کے اموال کو بجبر قبضے میں لایا جا سکتا ہے لیکن ان اموال

کے حلال ہونے کی علت کیا ہے اس کے لیے اس حدیث میں کوئی اشارہ موجود نہیں بلکہ اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الحربی کے نفوس و اموال کی عدم عصمت کسی حکم کی علت نہیں بلکہ ان کے شرک و بغاوت کی خود معلول ہے۔ اس بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ اموال و غنیمت و فے کے حلال ہونے کی علت ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے شریعت اسلامیہ میں کہیں کسی حکم کے لیے نفوس و اموال کا معصوم یا غیر معصوم ہونا اصل اور علت کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مال غنیمت وغیرہ کی حلت کی اصل علت

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب اموال غنیمت و فے کے حلال ہونے کی ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے تو پھر آخر اس کی علت کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مال غنیمت وغیرہ کے حلال ہونے کی اصل علت اس کائنات کے مالک حقیقی اللہ رب العالمین کا حکم اور اس کی اجازت ہے اللہ کی اجازت ہی نے غنیمت کو حلال کیا ہے، اگر اس کی اجازت نہ ہوتی تو قیامت تک کسی مسلمان کے لیے غنیمت حلال نہ ہوتی یہ کوئی قیاسی اور اجتہادی بات نہیں ہے بلکہ قرآن کریم کی نص صریح اس پر دلالت کر رہی ہے

لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ فَكُلُوا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلَالًا طَيِّبًا

اگر خدا کا نوشتہ پہلے نہ لکھا جا چکا ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا اس پر بڑا عذاب نازل ہوتا تو جو تم نے لوٹا ہے اب کھاؤ کہ حلال و طیب ہے۔

یہ آیت کریمہ تصریح کے ساتھ بتا رہی ہے کہ مال غنیمت و فدیہ کے حلال ہونے کی وجہ ان کا غیر معصوم ہونا نہیں ہے کیونکہ اگر ان کا غیر معصوم ہونا ہی علت حلت ہوتا تو اخذ پر عذاب کی دھمکی کیوں دی جاتی اور پھر فکلوا مما غنمتم حلالا طیبا کے امر صریح کی ضرورت ہی کیا پڑتی یہ آیت روز روشن کی طرح یہ بتا رہی ہے کہ مال غنیمت کی اصل علت فکلوا کا امر ربانی ہے نہ کہ اس کی عدم عصمت۔ مال غنیمت امت محمدیہ سے پہلے تمام دیگر انبیاء اور ان کی امتوں پر حرام تھا اور یہ پہلی آیت ہے جس نے اس کو حلال کیا اگر اس کے حلال ہونے کی علت اس کی عدم عصمت ہی ہوتی تو پھر اس پر قبضہ کرنے کے باوجود تمام امتوں پر وہ حرام کیوں ہوتا اور عتاب کے بعد اس امت پر حلال کرنے کے لیے صریح امر و اجازت نازل کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ اگلی امتوں پر غنیمت کی حرمت اور اس امت پر اس کی حلت کا پورا بیان بخاری شریف کی

کتاب فرض الخمس میں موجود ہے۔ اس طویل حدیث کے آخر میں ہے۔

ثم احل الله لنا الغنائم رای ضعفنا — پھر اس نے غنیمتوں کو ہمارے لیے حلال کردیا اس نے

وعجزنا فاحلها لنا — ہمارے ضعف و عجز کو دیکھا تو ہمارے لیے حلال کر دیا۔

حدیث کا یہ ٹکڑا عدم عصمت کے علت نہ ہونے کو اتنی وضاحت سے ثابت کر رہا ہے کہ اس سے زیادہ وضاحت ممکن نہیں اس حدیث میں تو شارع علیہ السلام صاف صاف بیان فرما رہے ہیں کہ اس امت کے ضعف عجز کو دیکھتے ہوئے اللہ نے اپنی رحمت سے غنیمت کو ہمارے لیے حلال کر دیا، اگر مال غنیمت کے حلال ہونے کی علت اس کا غیر معصوم ہونا ہے تو پھر اس حدیث کے کیا معنی ہوں گے؟ اس آیت کریمہ اور اس حدیث شریف نے بوضاحت یہ بات بتائی کہ مال غنیمت کے حلال ہونے کی علت مالک حقیقی رب العالمین کی اجازت ہے اور اس اجازت کی علت امت محمدیہ کا ضعف و عجز ہے حقیقت یہ ہے کہ کسی کا مال کسی دوسرے کے لیے حلال ہوتا ہی اس وقت ہے جب اس کے مالک کی اجازت و رضا حاصل ہو۔ بیع و فروخت ہو یا صدقہ و ہبہ، وراثت ہو یا وصیت چاہے جس ذریعہ سے بھی کوئی کسی کے مال کا مالک ہو ہر جگہ اس کے مالک کی اجازت حلت کی اصل علت بنی ہوئی ہے اور ان تمام اجازتوں کی تہ میں اصل اجازت مالک حقیقی کی شامل ہے یہی وجہ ہے کہ جب اس کی اجازت موجود نہیں ہوتی تو بعض موقعوں پر مالک مجازی کی اجازت کے باوجود مسلمان کے لیے اس کا مال حلال نہیں ہوتا۔ غنیمت و فے میں چونکہ ان اموال کے مالکوں کی اجازت و رضا حاصل نہیں ہوتی اس لیے سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ یہاں حلت کی کوئی اور علت ہے حالانکہ یہاں بھی مالکوں کے مالک کی اجازت و رضا حاصل ہے اور دراصل یہی اجازت و رضا ان اموال کو حلال کر رہی ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اپنے غلاموں کو قسم قسم کی نعمتیں اور طرح طرح کے اموال اس شرط پر استعمال کرنے کے لیے دے کہ ہماری اطاعت کرتے رہنا اور ہمارے حقوق نہ بھولنا، کچھ دنوں کے بعد ان میں سے چند اپنے آقا سے بغاوت کریں اور تمام عہد و پیمان توڑ ڈالیں، اس کے بعد آقا اپنے فرمانبردار غلاموں کو حکم دے کہ جاؤ ان سرکشوں کی سزا کرو اور ان کے اموال ان سے چھین لو اور اپنے تصرف میں لاؤ تو اب اصل مالک کی اجازت و رضا کے بعد ان سرکش غلاموں کی اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اب غور طلب یہ بات ہے کہ ان اموال میں خود کوئی ایسی صفت ہے جس نے دوسروں کے لیے ان کو حلال کر دیا ہے یا آقا کی اجازت اس کی اصل علت ہے

ظاہر ہے کہ آقا کی اجازت اصل علت ہے اس مال کی کوئی صفت علت حلت نہیں۔

فقہ حنفی کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ کفار اگر مسلمانوں کے اموال پر قبضہ کرلیں اور دارالاسلام سے نکل کر اپنے گھر پہنچ جائیں تو وہ ان کے مالک ہوجاتے ہیں لیکن اگر کفار آزاد مسلمانوں کو قید کرکے دارالحرب میں داخل ہوجائیں تو وہ ان کے مالک نہیں ہوتے اور آزاد مسلمان بہر حال آزاد ہی رہتے ہیں لیکن مسلمان اگر آزاد حربیوں کو گرفتار کرلیں تو وہ ان کافروں کے مالک ہوجاتے ہیں۔ اس فرق کی وجہ بتاتے ہوئے امام سرخسی لکھتے ہیں:

وذلك فی تملك رقاب الاحرار لان الآدمی فی الاصل خلق مالكا لا مملوكا فصفة المملوكية فيه تكون بواسطة ابطال صفة المالكية وذلك مشروع فی حقهم بطريق الجزاء فانهم لما انكروا وحدانية الله تعالىٰ جازاهم الله تعالىٰ علىٰ ذلك بان جعلهم عبيد عبيده

اور وہ آزاد لوگوں کے مالک ہونے میں ہے اس لیے کہ آدمی اصل میں مالک پیدا کیا گیا ہے نہ مملوک پس اس میں مملوکیت کی صفت مالکیت کی صفت کو باطل کردینے کے ذریعہ ہوتی ہے اور یہ کفار کے حق میں بطریق جزاء مشروع ہے اس لیے کہ انھوں نے جب اللہ کی وحدانیت کا انکار کیا تو اللہ نے ان کو اس کا بدلہ اس طرح دیا کہ ان کو اپنے غلاموں کا غلام بنا دیا۔

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس مسئلہ میں امام سرخسی رحمہ اللہ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ ٹھیک وہی بات ہے جو راقم نے غنیمت وفے میں بیان کی ہے یعنی یہی کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے سرکش و باغی غلاموں کو بطریق جزا اپنے فرمانبردار غلاموں کا غلام بنا دیا ہے اور اللہ کا "جعل" جواز مملوکیت کفار کی علت ہے اسی طرح اللہ نے بطریق جزا اپنے سرکش غلاموں کے اموال، اپنے فرمانبردار غلاموں کے لیے حلال کردیے ہیں اور اللہ کا "اذن" حلت غنیمت وفے کی اصل علت ہے۔

نتیجۂ بحث اس بحث سے یہ بات ثابت ہوئی کہ الحربی کے اموال مسلمانوں کے لیے اس لیے حلال نہیں ہیں کہ وہ غیر معصوم ہیں بلکہ اس لیے مباح اور حلال ہیں کہ اللہ کے امر نے ان میں اباحت اور حلت پیدا کردی ہے اس لیے کہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان کے اموال پر قبضہ و تصرف اللہ اور اللہ کے رسول کے اوامر

واحکام کے اتحت کرنا صحیح ہو گا۔ کسی ایسے طریقے سے اس پر قبضہ کرنا صحیح نہ ہو گا جس کی اجازت خدا و رسول نے نہ دی ہو۔ خدا ور سول نے کتاب و سنت میں کہیں بھی اس کی اجازت نہیں دی ہے کہ حربیوں کے اموال ایسے ذرائع سے بھی حاصل کیے جاسکتے ہیں جن کو انھوں نے خود بالتخصیص و تقییدؔ حرام قرار دیا ہے۔ دین اسلام نے حربیوں کے اموال حاصل کرنے کے دو طریقے بتائے ہیں۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ لوٹ کر، چھین کر، ان کو قتل کرکے، جلا وطن کرکے ان کے اموال پر قبضہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ طریقہ حربیوں کے ساتھ خاص ہے اور یہ سزا ہے ان کے شرک و سرکشی کی، کفر و بغاوت کی۔ دوسرا بیع و شرا و عقود و معاملات کا ہے۔ تملک و تملیک کا یہ طریقہ عام ہے۔ اس میں حربیوں کی کوئی خصوصیت نہیں اور یہی وہ طریقہ ہے جس میں طرح طرح کے فسادات اور بطالتیں ہوتی ہیں۔ دین اسلام نے عقود و معالات کے ان تمام فسادات کو سختی کے ساتھ روکا ہے جو معلوم نہیں کب سے دنیا پر مسلط تھے اور جنھوں نے دنیا کو امن و سکون سے محروم کر رکھا تھا۔ بیع و شرا اور عقود و معاملات کے طریقہ تملیک و تملک میں مسلمان اور حربی کا کوئی فرق نہیں۔ کسی عقد فاسد یا باطل سے جس طرح کسی مسلمان کے مال پر قبضہ کرنا جائز نہیں اسی طرح کسی حربی کے مال پر قبضہ کرنا بھی درست نہیں۔ دس روپے کے بدلے میں بیس روپے اگر کسی مسلمان سے لینا جائز نہیں تو بلا فرق کسی حربی سے لینا بھی جائز نہیں۔ دین اسلام نے اموال کی کوئی ایسی تقسیم نہیں کی ہے کہ ایک ہی قسم کے الفاظ ادا کرکے کسی ایک مال پر قبضہ کرنا حرام ہو اور بعینہ وہی الفاظ ادا کرکے کسی دوسرے مال پر قبضہ کرنا حلال ہو۔ عقل اور قیاس کے سوا کسی طرح بھی اس قسم کی دو عملی کا ثبوت نہیں بہم پہنچایا جا سکتا۔

خاتمہ کلام قرآن کریم، احادیث نبویہ اور آثار صحابہ کی روشنی میں یہ مسئلہ بالکل محقق ہو گیا کہ سود کی حرمت مطلق اور غیر مشروط ہے۔ دس کے بدلے میں بیس روپے حاصل کرنا قرض کی صورت میں ہو یا نقد کی صورت میں، حربی سے بھی اسی طرح حرام ہے جس طرح مسلمان سے۔ فقہ حنفی کی چھان بین کرنے سے بھی یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ امام اعظم اور امام محمد رحمہما اللہ کے مسلک کی بنیاد اس مسئلے میں صرف قیاس اور اجتہاد پر ہے اور جہاں پر نصوص اور قیاس و اجتہاد کا مقابلہ ہو وہاں پر ہمیں فقہ حنفی ہی یہ بتاتی ہے کہ قیاس و اجتہاد کو ترک کر دیا جائے۔

(باقی صفحہ ۱۸ پر)

(بقیہ مضمون صفحہ ۲۴) الاجتہاد لایعارض النص

لایقاس المنصوص علی المنصوص

لاقوام للدلالۃ مع النص

المتیقن بہ لایتبدل الامثلہ

فقہ حنفی کے ان مسلمہ اصول کے ہوتے ہوئے ہم مجبور ہیں کہ صریح نصوص کے مقابلہ میں قیاس و اجتہاد کو ترک کر دیں وما توفیقی الا باللہ الیہ ارجع والیہ انیب۔

خریداران ترجمان القرآن کی خدمت میں

(۱) پتہ تبدیل کراتے وقت اپنا نمبر خریداری ضرور لکھیے۔

(۲) ترسیل زر کے وقت منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور نمبر خریداری صاف تحریر کیجیے۔ ڈاکخانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف (Block letters) میں لکھیے۔